Negotiations 1:3 (2022) pp. 31-42 **ISSN: 2789-293X**

ناول "پری" میں ہمارے سیاسی نظام کی عکاسی

Reflection of Our Political System in the Novel "Pari"

Sadia Imtiaz
M.Phil Scholar,Urdu Department, University of Sialkot, Sialkot.
Amir Iqbal
Assistant Professor, Urdu Department, University of Sialkot, Sialkot.

KEYWORDS

Relationship
Journalism
Contribution
Social Evils
Terrorism
Struggle
Problems
Society

ABSTRACT

Khalid Fateh Mohammad is one of the most famous novelists of the 21st century. His work is an interesting school of diverse themes, however, mainly about recurring mundane issues that concern common people. These include love/hate relationship, life struggles and social/psychological problems which essentially result from the vicious corollary of existing social inequalities in our society. Khalid Fateh Muhammad's relatively recent novel is "Pari" in the pee novel, the novelist describes the political system. In the novel, Khalid Fat eh Mohammad explains how bureaucrats and politicians get involved in politics together. And politicians also risk national integrity for their own integrity for their own benefit. In this novel, novelist has also written role of agencies. Institutions have hand in shaping and conducting any politics. No political party can take any decision against the will of institutions. The novel is based on the reality and our current political system.

DATES

Received	13-06-2022
Accepted	14-07-2022
Published	20-09-2022

QR CODE

خالد فتح محمد عصرِ حاضر کے فکشن نگاروں میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ اِن کے ناول موضوعاتی لحاظ سے انفرادیت کے حامل ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اُنہوں نے ناول نگاری کے سفر کا آغاز کیا۔ انہوں نے ملک کی سماجی، سیاسی اور معاشی صورتِ حال کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ انہوں نے عام آدمی کے مسائل، خواہشات، محبتوں اور کاوشوں کی اپنے ناولوں میں منظر کشی کی۔ ناولوں میں غریبوں پر ہونے والے مظالم کو بھی اُجاگر کیا۔ ان کے ناول انسانیت کا درس دیتے ہیں اور معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں۔ ہر ناول پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ کہانی ہمارے اِرد گرد گھوم رہی ہے اور تمام کردار ہمارے معاشرے کا حصہ ہیں۔

خالد فتح محمد وطن سے محبت رکھنے والے ناول نگار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے ناولوں میں زیادہ تر پاکستان کی تاریخ اور پاک فوج کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔ اس کے علاوہ عام آدمی کے مسائل اور ان کی وجوہات بھی پیش کی ہیں۔ یوں کہہ سکتے ہیں کہ خالد فتح محمد نے ایسا ادب پیش کی ہے جو معاشرے کی حقیقی تصویر پیش کرتا ہے۔ ممتاز شیریں نے کہا تھا:

> "وہ ادب جو زندگی کو اپنے حقیقی روپ میں پیش کرے، جس میں زندگی کی تفسیر ہی نہیں تنقید بھی ہو اور جس میں زندگی کو بہتر بنانے کی صلاحیت ہو"[1]

خالد فتح محمد کے ناول "پری" کے دو مرکزی کردار زہرہ جبیں اور معظم ہیں۔ یہ ناول تین فصلوں پر مشتمل ہے۔ ناول موجودہ سیاسی صورت حال کی عکاسی کرتا ہے۔ اس ناول میں ملکی حالات اور حکمرانوں کے کردار کو بیان کیا گیا ہے۔ خالد فتح محمد آمرانہ چلاکیوں اور بیوروکریٹس کی حقیقت کو سامنے لائے ہیں۔ انہوں نے اس ناول میں بتایا ہے کہ کیسے ہمارے حکمران اپنے مفاد کے لیے لوگوں کا استعمال کرتے ہیں اور اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے عورتوں کو مہرہ بناتے ہیں۔ ناول نگار نے سرمایہ دار طبقے کی منافقت کو بھی اپنے ناول میں بیان کیا ہے۔

معظم اس ناول کا ہیرو ہے جو کہ ایک بہت کامیاب بزنس مین ہے۔ زہرہ جبیں اس کی پرسنل سیکرٹری اور ناول کی ہیروئن ہے۔ معظم اس کی خوبصورتی دیکھ کر اس پر فدا ہو جاتا ہے اور اس کو پری کے نام سے پکارتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ یہ ناول ان دونوں کی محبت کی داستان بیان کرتا ہے۔ ناول میں ایجنسیوں کی طاقت اور سیاست میں ان کی دخل اندازی کو بھی سامنے لایا گیا ہے کہ کیسے وہ اپنی طاقت کے بل بوتے سیاست دانوں کو استعمال کرتے ہیں۔

ناول نگار نے بیان کیا ہے کہ کیسے کاروباری لوگ اپنے کاروبار کو بڑھانے کے لیے دوسری شادی کر لیتے ہیں اور ذاتی مفاد حاصل کرنے کے لیے اپنی بیویوں کو کوروباری پارٹیوں کی زینت بناتے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک ان کا دین ایمان صرف پیسہ اور ان کا کاروبار ہوتا ہے۔ اپنے کاروبار کی ترقی کے لیے یہ لوگ کسی کی جان لینے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

---

[1] عبداللہ حسین، **اداس نسلیں (طباعت چہارم)** (لاہور: قوسین پبلشرز، 1984ء)، 294۔

اس ناول میں جہاں یہ بتایا ہے کہ سرمایہ دار خود غرض ہوتا ہے اور اپنے مفاد کے لیے کیسے لوگوں کا استعمال کرتا ہے اسے صرف اپنے فائدے سے غرض ہوتی ہے۔ وہاں ایسے کارکنوں اور کمپنیوں میں کام کرنے والے لوگوں کے بارے بھی بتایا ہے کہ اگر کسی کمپنی کا مالک کسی دن کام پر نہ جائے تو کیسے وہ لوگ کام میں لاپرواہی اور سستی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں ایسا عام ہوتا ہے کہ جب مالک دفتر نہ آئے تو لوگ کام پر توجہ نہیں دیتے اور خوش گپیوں میں سارا سارا دن گزار دیتے ہیں۔ ان لوگوں کو اس بات سے فرق نہیں پڑتا کہ ان کی لاپرواہی کی وجہ سے کمپنی کا نقصان بھی ہو سکتا ہے۔ ناول نگار نے ناول میں اس کی عکاسی کی ہے کہ معظم ایک کامیاب صنعت کار ہے لیکن جس دن وہ دفتر نہ جائے تو اس کے دفتر کا ماحول تساہل پسندی کا شکار ہو جاتا ہے:

> "اس رات میں گھر پر دیر سے پہنچا۔ صبح اٹھا تو سر میں درد تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اکثر شب بیداریاں اس قسم کی اعضا شکنی کی وجہ بنتیں۔ میں دفتر ہمیشہ وقت پر پہنچتا ہوں۔ اپنے وسیع تجربے میں، میں نے کامیاب سربراہ کو وقت کا پابند دیکھا ہے۔ ایک تنظیم کے مختلف کل پرزوں کو صحیح سمت میں چالو رکھنے والا Lubricant ہے۔ اگر میں نو بجے تک دفتر نہ پہنچوں تو شفقت میری معذوری سمجھ جاتی ہے۔ میرے کارندے کتنے ذمے دار ہیں میں بخوبی سمجھتا ہوں۔ اگر میں دفتر میں نہیں تو ماحول قدرے تساہل پسندی کا ہوتا ہے۔ اس کو میں بطور ایک حکمت عملی تو نہیں لیکن ایک حقیقت کے طور پر قبول کرتا ہوں"[2]

سرمایہ دار کا کوئی مذہب اور ایمان نہیں ہوتا۔ یہ ایک خود غرض طبقہ ہے۔ جب ملک تقسیم ہوا تو اس وقت ملک کو بہت سے مسائل اور مشکلات کا سامنا تھا۔ صنعتی اور معاشی لحاظ سے ملک بہت خسارے میں تھا۔ تقسیم کے وقت مقامی لوگوں اور ہجرت کر کے آنے والے لوگ بہت سے مسائل سے دوچار تھے۔ تین چار سال بعد لوگوں نے خود کو سنبھالنا شروع کیا اور یہ وقت تھا ملک کو مضبوط کرنے کا، لیکن اسے حالات میں بھی کچھ لالچی اور خود غرض سرمایہ داروں نے ملک کو لوٹنا شروع کیا اور ترقی کی سیڑھی پر چڑھنے کے لیے لوگوں کو کچلنا شروع کر دیا۔ ان میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے اپنے مفاد اور ترقی کی خاطر لوگوں کی زندگیوں کو داؤ پر لگا کر اپنے کاروبار کو ترقی دی۔ معظم کا باپ بھی ایسا ہی خود غرض صنعت کار تھا جس نے اپنی کاروبار کو کامیاب بنانے کے لیے اپنے حصہ دار کو بھٹی میں دھکیل دیا تاکہ وہ اس سے اپنا حصہ نہ مانگ سکے۔ خالد فتح محمد نے ایسے لوگوں کے چہروں سے نقاب اتار کر ان کی حقیقت کو آشکارا کیا ہے:

> "ملک کو بنانے والے اور اور اس میں رہنے والے ایک دوڑ میں جت گئے۔ اس دوڑ کو جیتنے کے لیے دولت اور جائیداد کا فیتہ کاٹنا تھا۔ ترقی کی سیڑھی افراتفری کا شکار تھی۔ لوگ پیروں تلے کچلے جا رہے تھے۔ بعض لوگوں نے اس زینے کو ترک کر

---

[2] خالد فتح محمد، **پری** (لاہور: موسیٰ کاظم پرنٹرز، 2006ء)، 11۔

دیا۔انہوں نے سیڑھی والی دیوار پر کمندیں ڈالنا شروع کر دیں۔میرا باپ بھی ان میں شامل تھا۔اس نے ایک رات اپنے شراکت دار کو بھٹی میں دھکیل دیا"[3]

جب ملک تقسیم ہوا تو لوگوں کو بہت سے مسائل اور مشکلات کا سامنا تھا اور ملکی ترقی کے لیے بہت سی محنت کی ضرورت تھی۔اس وقت ملک بالکل خسارے میں تھا۔ایسے حالات میں کچھ چالاک اور مکار لوگوں نے آنے والے دنوں کا اندازہ لگا کر اپنے مفاد کے لیے ایسی پیش بندی کی کہ دوسرے لوگوں کو پیروں تلے روندھنا شروع کیا اور اپنی مکاریوں اور چالاکیوں کی وجہ سے ایسے کاروبار شروع کیے جن میں زیادہ سے زیادہ منافع کمایا جا سکے۔خالد فتح محمد نے اپنے ناول میں بہت خوبصورت انداز سے اس کی عکاسی کی ہے۔اس ناول کا ہیرو معظم بتاتا ہے کہ کیسے اس کے باپ نے اپنی مکاری اور خود غرضی سے صنعت لگا کر دوسروں کی بے بسی کا فائدہ اٹھایا:

"میرے باپ نے اندازہ لگایا کہ مستقبل صنعت میں ہے۔ملک ایک نومولود بچے کی طرح ہے۔بچے نے پھلنا پھولنا ہے۔وقت کے ساتھ ساتھ اس کے نقوش واضح ہونے ہیں۔معاشرے نے اپنی تشکیل مکمل کرنی ہے۔ترقی کا زینہ ابھی خالی ہے۔یک لخت ایک ہجوم نے اس پر دھاوا بولنا ہے۔افراتفری میں لوگ کچلے جائیں گے۔صرف طاقت ور لوگوں نے واحد سیڑھی کی بدولت بلند ترین مقام تک پہنچنا ہے۔وہ شاید اتنا تناور نہیں تھا۔اس نے فیصلہ کیا کہ جب تک لوگ سکتے میں ہیں وہ سیڑھی کی جانب چل پڑے"[4]

ناول نگار نے اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھایا ہے کہ بڑے بڑے بزنس مین اور سرمایہ دار لوگ اپنے کاروبار میں مفادات کی خاطر دوسری شادی کرتے ہیں۔ایوب خاں کے دار میں جب صنعت کاری کو فروغ ملا تو لوگوں کی سوچ ہی بدل گئی انہوں اپنے کاروبار میں فائدے کے لئے اپنی ہی عورتوں کو پیش کرتے ہیں۔سرمایہ دار لوگوں نے صنعت کاری میں فائدہ حاصل کرنے کے لیے دوسری شادی کو ترجیح دی۔کاروبار کی بڑھوتری کے لیے اپنی عورتوں کو بڑی بڑی محفلوں اور پارٹیوں میں میں شمولیت اختیار کرنے کے لیے تیار کیا جاتا۔اس طرح ان کو اپنے کاروبار میں کافی منافع ہوتا۔معظم کے باپ نے بھی موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دوسری شادی کی اور اس طرح اس کو بھی اپنے کاروبار میں کافی فائدہ ہوا۔اس کی زندگی بدل گئی رہن سہن کا طریقہ تبدیل ہو گیا۔خالد فتح محمد نے بہت خوبصورت انداز میں اس کو بیان کیا ہے:

---

[3] ایضاً،16۔

[4] ایضاً،17۔

"میرے باپ نے اپنی خاندانی موقع شناسی بروئے کار لاتے ہوئے دوسری شادی کر لی۔ میلے دھوتی کرتا کے بجائے سفید بے داغ شلوار قمیض اور پھر تھری پیس سوٹ پہننا شروع کر دیا تھا۔ تھوڑی بہت انگریزی بھی سیکھ لی تھی۔ یہ الگ بات کہ وہ پنجابی، اردو اور انگریزی ایک ہی لہجے میں بولتا تھا"[5]

ہمارے معاشرے کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ درمیانے طبقے میں لڑکیوں کی شادیوں کے بہت سے مسائل پیش آتے ہیں۔ لڑکیوں کو تعلیم حاصل کرنے کا شوق ہوتا ہے اور ان کا خیال ہوتا ہے کہ تعلیم ہی سب کچھ ہے اس کے بغیر غربت ختم نہیں ہو سکتی۔ ہمارے معاشرے میں مڈل کلاس لوگ ذات پات کے نظام میں بندھے ہوتے ہیں یہ لوگ اکثر شادیاں اپنے ہی خاندان میں کرتے ہیں۔ لوگ ذات سے باہر شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ جہاں ان کی لڑکیاں تعلیم یافتہ اور باشعور ہوتی ہیں وہاں دوسری طرف ان کے لڑکے تعلیم سے اتنے ہی دور ہوتے ہیں اور ان میں شعور کی کمی ہوتی ہے۔ لڑکے اپنا زیادہ وقت ادھر ادھر کی محفلوں میں ضائع کرتے ہیں۔ ان کی خواہش اپنی ہی برادری کی پڑھی لکھی اور ملازمت کرتی لڑکی سے شادی کی ہوتی ہے۔ لیکن پڑھی لکھی لڑکی ایسے لڑکوں سے شادی کو ترجیح نہیں دیتی۔ اس لیے مڈل کلاس خاندان کی لڑکیوں کی شادیاں جلد نہ ہونا ہمارے معاشرے کا ایک المیہ ہے۔ خالد فتح محمد اس ناول میں اس حقیقت کو سامنے لائے ہیں:

"اس پس منظر حالات کی روشنی میں اس کی شادی نہیں ہو سکتی تھی۔ شفقت کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا۔ نچلے درمیانی طبقے کی لڑکیوں میں تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ وہ محسوس کرتی ہیں کہ غربت کی لکیر کو تعلیمی اہلیت کے بغیر پار نہیں کر سکتا۔ اس طبقے کے لڑکوں میں ایسا شعور نہیں ہوتا۔ وہ اپنا قیمتی وقت ادھر ادھر کی محفلوں میں ضائع کر دیتے ہیں۔ ان کی اکثریت میں ترقی کا جذبہ مفقود ہوتا ہے۔ یہ لوگ ذات پات کے کڑے نظام میں بندھے ہوتے ہیں، اور اپنی برادری کی پڑھی لکھی، برسرِ روزگار لڑکیوں سے شادی کروانے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ مگر پڑھی لکھی لڑکیوں کا ایسے لڑکوں کو رد کر دینا ایک قدرتی سی بات ہے"[6]

ناول نگار نے اداروں کی سیاست میں مداخلت کو بھی اپنے ناول میں بیان کیا ہے کہ صدر ایوب خاں کے بعد یحییٰ خاں آ گیا یعنی ایک آمر کے بعد دوسرے آمر کی حکومت آ گئی۔ ایوب خاں کو رخصت کرنے میں یحییٰ خاں کا ہاتھ تھا۔ بعد میں ملک دو ٹکڑے ہو گیا اور جو پاکستان کا حصہ بچا اسے ذوالفقار علی بھٹو نے سنبھالا۔ بھٹو کی منتخب جمہوری حکومت تھی لیکن اسے قید کر دیا گیا اور پھر قید میں ہی پھانسی کی سزا سنا دی گئی اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ بھٹو کے بعد ضیاء الحق کی حکومت آئی اور وہ ایک فضائی حادثے کا شکار ہوا۔ اسی طرح بعد میں جتنی بھی حکومتیں آئی ان پر مختلف الزامات لگا کر ان کو گرا دیا جاتا۔ یہ سارا کچھ ہماری ایجنسیاں کرتی رہیں اور حکومت بنانے اور گرانے میں انہیں کا ہاتھ رہا۔ اس کی عکاسی ناول نگار نے بہت خوبصورت انداز میں کی ہے:

---

[5] ایضاً، 23۔

[6] ایضاً، 32۔

"ہمارے ہاں کی حکومتیں کبھی معیاد پوری نہیں کر سکیں۔اور ہمارے فوجی حکمران بھی اپنے طے شدہ منصوبوں کے مطابق حکومت سے کبھی علیٰحدہ نہیں ہوئے۔ایک آمر کو دوسرے نے چلتا کیا جو ایسے بین الاقوامی گرداب میں گھرا کہ ملک کے ایک حصے کو علیٰحدہ خود مختار دیس بنوا گیا۔اسے نظر بند کر دیا گیا اور اس دوران میں اس کی موت واقع ہو گئی۔پہلی جمہوری حکومت فوج کے قبضے میں آئی اور آمر خود ہوائی حادثے کی نذر ہو گیا۔بعد کی حکومتوں کو ملک کے صدر برطرف کرتے رہے"[7]

دوسرے ملکوں میں جب بھی حکومتی سطح پر اجلاس بلایا جاتا ہے تو اس کا مقصد ملک کی بھلائی اور بہتری کے لیے بات چیت کرنا ہوتی ہے۔ہمارے ملک میں سیاسی لوگ صرف دولت سمیٹنے اور ملکی ساکھ کو نقصان پہنچانے کے لیے سیاست میں آتے ہیں۔یہاں سیاست دان جب بھی کوئی اجلاس منعقد کرتے ہیں تو اس کے ٹی اے۔ڈی اے کی مد میں تو لاکھوں کا خرچ آجاتا ہے لیکن اس میٹنگ یا اجلاس کا ملک کو کوئی فائدہ نہیں ہو تا بلکہ الٹا ملکی خزانے کو نقصان پہنچتا ہے، تمام سیاسی لوگ خوش گپیاں لگا کر اور چائے کے ساتھ دیگر لوازمات کھا پی کر چلے جاتے ہیں ۔خالد فتح محمد نے اس کی عکاسی بہت عمدہ انداز میں کی ہے ۔وزیر اعظم نے جو اجلاس بلایا اس کا ایجنڈا داخلی اور خارجی امور پر بات کرنا اور پڑوسی ملک کے وزیر اعظم کی دعوت کے بارے پلاننگ کرنا تھا لیکن اجلاس میں تمام لوگ ایک دوسرے سے باتیں کر کے اور ہنسی مذاق کر کے چلے گئے اور وہ مقصد ادھورا رہ گیا جس کے لیے اجلاس بلایا گیا تھا:

"وزیر اعظم سامنے میز پر کہنیوں تک بازو رکھے بیٹھے تھے۔اسی انداز میں بیٹھے انہوں نے بغیر بازو ہلائے یا آنکھیں جھپکے بولنا شروع کر دیا۔موٹروے ایکسٹینشن پر دیر تک گفتگو جاری رہی۔ایک کرکٹ میچ کا واقعہ سنایا گیا۔بعد میں پتہ چلا کہ موصوف جب بھی آؤٹ ہوئے امپائر نے وہ مخصوص گیند "نو بال" قرار دے دی۔بات چیت کا رخ پھر اندرونِ لاہور کے غیر معروف کھانے پینے کی دکانوں کی طرف مڑ گیا۔وہاں سے پڑوسی وزیر اعظم کے کھانے کا مینیو زیر بحث آیا۔وزیر اعظم ایسا مینیو تیار کروانا چاہتے تھے جس میں پاکستانیت کے ساتھ لاہوریت بھی پائی جاتی ہو۔ان کے رفقا میں سے کسی نے فقرہ کسا کہ پڑوسی وزیر اعظم تو بمشکل چند نوالے ہی کھانا کھاتا ہو گا کہیں سارا اہتمام دھرے کا دھرا نہ رہ جائے!ایک طرف سے آواز آئی کہ وہ تو صرف چند نوالے ہی کھائے گا، دیگیں تو ہم ہی صاف کریں گے!اس طرح ایک اہم موضوع پر بلایا گیا اجلاس غیر اہم گفتگو کی نذر ہو گیا"[8]

جو دولت معاشی اصولوں کو مد نظر رکھ کر حاصل کی جاتی ہے وہ بہت محنت کرنے سے جمع ہوتی ہے۔اس میں مزید اضافے کے لیے پیداواری ذرائع بڑھائے جاتے ہیں اور اسکی حفاظت بھی خون، پسینے اور ذمہ داری سے کی جاتی ہے۔جو دولت ناجائز ذرائع سے حاصل کی جائے اس میں برکت نہیں ہوتی۔جیسا کہ اس ناول میں خورشید اقبال اور اس کے گاشتدوں نے نے ملکی تقسیم کے وقت ناجائز ذرائع سے دولت اکٹھی

---

[7] ایضاً، 51۔

[8] ایضاً، 55۔

کی اور ملک کی ابتر صورت حال اور وسائل سے انہوں نے فائدہ اٹھایا۔ لوگوں کی حق تلفی کر کے دولت حاصل کرنے کو جائز وسیلہ سمجھا۔ ایسے لالچی لوگ اپنے چھچھورے پن کی وجہ سے لوگوں سے ان کا حق چھین کر خود قابض ہو جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک صرف دولت حاصل کرنا ہی اہم ہوتا ہے۔ لوگوں کے ساتھ زیادتی اور ملکی نقصان ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ناول نگار نے اپنے ناول میں اس پہلو کو بھی عمدہ انداز میں پیش کیا ہے:

"خورشید اقبال اور اس کے قبیلے کے دوسرے لوگوں کو دولت انقلاب کی بدولت حاصل ہوئی۔ تقسیمِ ملک نے ان لوگوں کو متعدد ناجائز اور غیر اخلاقی مواقع فراہم کیے۔ انہوں نے حق تلفی جائز وسیلہ سمجھا اور نئے ملک کے بکھرے ہوئے وسائل کو ہوس کا نشانہ بنایا"[9]

جب ملک بنا تھا تو اس میں دو طرح کے لوگ تھے۔ ان میں سے ایک تو وہ لوگ تھے جو یہ چاہتے تھے کہ ملک کے حالت ٹھیک کرنے کے لیے کام کیا جائے جبکہ دوسری طرف وہ لوگ تھے جو یہ چاہتے تھے کہ ملک کی ہر چیز پر اپنا قبضہ جمانے کے لیے کام کیا جائے۔ یہ ایک ایسی جنگ تھی جس میں بیوروکریٹس نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اور غلط کو غلط کہنے کی بجائے صحیح کہا۔ ان لوگوں نے ملک کے بڑے بڑے عہدوں پر اپنا قبضہ کیا اور پھر ان کا ناجائز استعمال کیا۔ جب ملک بنا تو سیاست دانوں نے اپنا کردار ادا نہیں کیا اور فوج کو آگے آنے کا موقع ملا۔ سیاسی لوگ اس اہل نہیں تھے کہ وہ ملک کی صورتحال کو کنٹرول کر سکتے نہ ان کے پاس اتنا تجربہ تھا۔ یہ ایسا خلا تھا جس کی وجہ سے فوج سیاست میں داخل ہوئی۔ بہت سے ایسے سیاسی عہدے تھے جنہیں سیاست دان چلانے میں ناکام ہوئے تھے تو فوج نے ان پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح ہر بڑے فوجی کے پاس دو دو بڑے عہدے ہیں ایک سیاسی عہدہ اور ایک فوجی عہدہ۔ ناول نگار نے اس ناول میں اس کی بہت عمدہ تصویر کشی کی ہے:

"جب ملک بنا تو یہاں دو قسم کے لوگ تھے، ایک وہ جو سوائے اپنے حصے کے اور کچھ نہیں چاہتے تھے اور دوسرے وہ جو ہر ایک کے حصے پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ یہ ایک ایسی جنگ تھی جس میں بیوروکریسی نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انہوں نے غلط کو غلط نہیں بلکہ صحیح کہا۔ یہیں سے ملک بھول بھلیوں میں گم ہو کے کمزور اور جانبدار گورنس کی نظر ہو گیا۔ سیاست دان ابھی اتنے اہل نہیں ہوئے تھے کہ وہ اس لاوے کے بہاؤ کو روک سکتے۔ ان کی ناتجربہ کاری کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے کمانڈر ان چیف کو وزیر دفاع بنا کے ملک کے سیاسی ارتقا کو روک دیا۔ بعد میں اس کے پسندیدہ بیوروکریٹس نے چند ایک منفرد کارہائے نمایاں سر انجام دئے۔ اس میں سیاسی جماعتوں کا قلعہ قمع اور طبقاتی خلیج کو مزید وسیع کرنا تھا"[10]

قیامِ پاکستان سے ہی ہماری معیشت کا دارومدار امریکہ پر رہا ہے۔ امریکہ ہی ہمیں چلا رہا ہے اور ہم امریکہ سے ہی قرضے لیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہمیں اس کی تمام پالیسیوں کو ماننا پڑتا ہے۔ دوسرا فوجی جرنیل جس نے پاکستان میں مارشل لا لگایا تھا اس نے وزیر اعظم کو ہٹا کر اس

[9] ایضاً، 77۔

[10] ایضاً، 91۔

ملک میں وہ وہ سیاہ کام سر انجام دیئے جس کے دلدل سے آج تک ہمارا ملک نکل نہیں سکا۔ پاکستان کا جو پہلا کمانڈر آف چیف تھا اس نے ایسے بیوروکریٹس اکٹھے کیے جنھوں نے اس ملک کا معاشی نظام ایسا بنایا کہ ملک کی جتنی بھی بڑی بڑی صنعتیں تھیں ان پر صرف چند ایک لوگوں کا قبضہ ہو کر رہ گیا۔ وہ تمام بڑی بڑی انڈسٹریز بڑے بڑے لوگوں نے لگا لیں۔ کچھ عرصہ بعد عام لوگوں نے بھی انڈسٹریز لگانی شروع کر دی تو اس طرح عام لوگوں کے پاس بھی پیسہ آنا شروع ہو گیا جو کہ حکومتِ پاکستان اور امریکہ کو ہضم نہیں ہوا۔ امریکہ کی پالیسی کے مطابق حکومت پاکستان نے تمام پرائیویٹ اداروں کو قومی تحویل میں لیتے ہوئے نیشنلائزیشن کیا۔ اس طرح ان کمپنیوں میں فائدے کی بجائے نقصان ہونا شروع ہو گیا کیونکہ حکومت نے نیشنلائزیشن کر کے ان اداروں کو اپنے ماتحت کر کے نااہل لوگوں کے سپرد کر دیا جو کمپنیوں کو اچھے طریقے سے نہ چلا سکے۔ اس طرح فائدہ ہونے کی بجائے الٹا نقصان ہونا شروع ہو گیا۔ فوجی افسران اور بیوروکریٹس کا نظریہ تھا کہ دولت صرف چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جائے۔ ناول نگار نے اس ناول کے ذریعے اس حقیقت سے بھی آگاہی دی ہے:

> "ہمارا جھکاؤ امریکہ کی طرف رہا اور وہی معاشی طور پر ہمیں استحکام دیئے ہوئے تھا۔ ملکی صنعت اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی کوشش میں تھی۔ اس تناظر میں پہلا کمانڈر ان چیف اپنے تمام تر کرومز کے ساتھ سٹیج پر آیا۔ اس نے بیوروکریٹوں کی ایک ٹیم ترتیب دی۔ اس ٹیم میں بڑے نام شامل تھے۔ ان لوگوں نے اپنی وفاداری ثابت کرنے کے لیے ہر اس نظریے کی تائید کی جو فوجی نقطہ نظر کا حامی تھا۔ انہوں نے دولت کو پھیلانے کے بجائے سکیڑنے کو ترجیح دی جس کے نتیجے میں بائیس خاندان معرض وجود میں آئے۔ ان کا نظریہ تھا کہ دولت غریبوں تک پہنچنے کی بجائے چند ایک ہاتھوں میں ہو جہاں سے وہ چھوٹے چھوٹے سوراخوں سے باہر نکلتی رہے"[11]

ہمارے ملک میں جب بھی کوئی دوسرے ملکوں سے کوئی امداد آتی ہے تو اسے اوپر بیٹھے افسر کھا جاتے ہیں اصلی حقدار اس سے محروم رہتے ہیں۔ اگر اصلی حقدار تک امداد پہنچے بھی تو وہ امداد کا آدھا حصہ بھی نہیں ہوتی۔ جتنی امداد جہاں پہنچنی چاہیے اس کا نصف بھی وہاں تک نہیں جاتا۔ لالچی افسر اس امداد میں بھی اپنا حصہ رکھ لیتے ہیں۔ روس نے جب افغانستان پر حملہ کیا تو امریکہ نے ہماری امداد کرنا شروع کی امریکہ کی امداد قسطوں میں ہوتی تھی اور مختلف افسر اس کی نگرانی کرتے تھے وہ اس امداد میں سے اپنا حصہ رکھتے تھے اور جتنی امداد جہاں پہنچانی ہوتی تھی اس سے کہیں کم ضرورت مندوں ملتی۔ افسران دولت سمیٹتے رہے۔ اس سے انفرادی فائدے حاصل کیے گئے۔ جب عالمی طاقت کے انخلا کے بعد تجزیہ کیا گیا تو ملکی حالت بہتر ہونے کی بجائے پہلے سے بھی ابتر ہو گئی تھی۔ فوجی بیوروکریٹس اور سویلین نے مل کر ملک کو ترقی کی پٹری سے نیچے دھکیل دیا۔ خالد فتح محمد نے اپنے ناول کے ذریعے اس حقیقت سے قارئین کو روشناس کروایا:

> "اقوامِ متحدہ نے مہاجرین کے لیے دفاتر قائم کر کے عملہ تعینات کیا۔ کئی بین الاقوامی تنظیمیں بھی اس کار خیر میں کود پڑیں۔ نتیجتاً ملک میں ہر طرف سے اسلحہ اور مالی امداد پہنچنا شروع ہو گئی۔ امداد کو تقسیم کرنے والے ذمے دار افراد دولت

[11] ایضاً، 92۔

سمیٹتے رہے۔ جتنا جہاں جانا چاہیے تھا اس سے بہت کم وہاں پہنچا۔ پڑوسی کے بحران کو قومی ذریعہ بنانے کی بجائے انفرادی فائدے حاصل کیے گئے۔ عالمی طاقت کے انخلا کے بعد جب ہم نے تجزیہ کیا تو ملک کی حالت پہلے سے بھی ابتر تھی۔۔۔ سویلین اور فوجی بیوروکریٹوں نے مل کے ملک کو ایک بار پھر ترقی کی پٹری سے نیچے اتار دیا"[12]

پاکستان نے آج تک کوئی ترقی نہیں کی، ہم نے نا تو زراعت میں کوئی خاص ترقی کی ہے اور نہ ہی ہم نے کوئی صنعتی ترقی کی ہے۔ پاکستانی عوام کو ہمیشہ غلط حقائق بتائے جاتے ہیں کہ ہمارے ملک نے ہر شعبے میں بہت ترقی کر لی ہے۔ حالانکہ ہمارا ملک ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے ہے۔ عوام کو بتایا جاتا ہے کہ ہمارے ملک میں وافر مقدار میں اناج کی پیداوار ہوتی ہے جبکہ ایسا کچھ نہیں بلکہ ہمارے ملک میں لوگوں کی ضرورت سے کم اناج پیدا ہوتا ہے اور ہم ہر سال باہر سے اناج منگواتے ہیں۔ یہی حال ہمارے ملک میں چینی کا بھی ہے۔ ہمارے ملک میں آج تک زرعی میدان میں کسان اور صارف کے درمیان ہم خرید و فروخت کا توازن قائم نہیں کر سکے، ہمارے دونوں طبقے ایک دوسرے سے عدم اعتماد کا شکار رہتے ہیں۔ ناول نگار نے ناول میں اس سچائی کو بھی واضح انداز میں بیان کیا ہے:

"آپ نے دیکھا کہ آج تک ہم صنعتی سطح پہ کتنی ترقی کر گئے ہیں۔ زراعت میں بھی ایسے ہی ہے۔ ماسوائے خود کفالت کے چند سالوں کے زرعی میدان میں ہم چکروں میں الجھے رہے۔ ہمیشہ غلط اعداد و شمار دے کر قوم کو گمراہ کیا گیا اور بعد میں گندم درآمد کی گئی۔ ایسی ہی بدانتظامی چینی کے سلسلے میں رہی۔ زرعی میدان میں ہم صارف اور کسانوں کے درمیان خرید و فروخت کا توازن قائم نہ کر سکے۔ دونوں طبقات غیر مطمئن ہیں"[13]

جب کسی بیوروکریٹ یا سرمایہ دار کو ایجنسیوں کی طرف سے الیکشن لڑنے کی آفر ہو اور وہ اس سے انکار کرے تو ادارے اس کی راہ میں مشکلات کھڑی کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کے کاروبار کو نقصان پہنچایا جاتا ہے۔ انکم ٹیکس، یونین اور ایسے کئی مشکلات ان کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ ان کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ ان کی بات مان لیں۔ اگر وہ ان کی آفر کو قبول کر لیتے ہیں تو پھر وہ ہر طرح سے مضبوط ہو جاتے ہیں ان کے کاروبار کو وسیع کرنے کے لیے ان کو مواقع فراہم کیے جاتے ہیں۔ ان کے خاندان والوں کو ہر طرح کی سہولیات میسر ہوتی ہیں۔ معظم کو ان کی تجویز ماننے کے لیے جب پری راضی کرتی ہے تو ان دونوں کے درمیاں جو گفتگو ہوتی ہے کچھ اس طرح سے ہے:

"آپ میری فکر نہ کریں میں خود کو سنبھال سکتی ہوں۔۔۔ ہمارے پاس دو آپشن ہیں۔ اگر ہم ان کی تجویز رد کرتے ہیں تو وہ لوگ آپ کی ذات کی بجائے کاروبار کو نقصان پہنچائیں گے۔ یونین، انکم ٹیکس، پیداواری اشیاء کا معیار اور ایسی کئی دیگر

---

[12] ایضاً، 94۔

[13] ایضاً۔

مشکلات راہ میں حائل ہوں گی۔ان سے اتفاق کرنے کی صورت میں یہ سب نہیں ہو گا بلکہ آپ کی کاروباری ساکھ اور صنعتوں سے متعلق تمام مسائل ختم ہو جائیں گے۔یہی نہیں آپ اپنے گروپ کو مزید وسعت دے سکیں گے "[14]

سرمایہ دار صرف اپنے مفاد سے غرض رکھتے ہیں۔اگر وہ سیاست میں کسی پارٹی کے ساتھ شمولیت اختیار کرتے ہیں تو اس میں بھی ان کا اپنا ذاتی مفاد شامل ہوتا ہے۔وہ اس بات کو جانتے ہوتے ہیں کہ اگر وہ سیاست میں شامل ہوتے ہیں تو اس سے ان کے کاروبار کو وسعت ملے گی۔ان کو ترقی کرنے کے لیے مزید مواقع فراہم ہوں گے۔ان کا خاندان مضبوط ہو گا اور ان کو ہر طرح کی سہولیات میسر ہو گی۔اس لیے یہ لوگ صرف اپنے مفاد کے لیے جاتے ہیں اور جتنے بھی سیاست دان ہیں وہ اپنے اپنے کاروبار میں ترقی کے لیے سیاست میں شامل ہوتے ہیں تا کہ ملکی خزانہ لوٹ سکیں۔ان کو سیاست میں لانے کے لیے ایجنسیاں اپنا کردار ادا کرتی ہے۔معظم کی بھی سیاست میں شمولیت کی وجہ یہی تھی کہ وہ اپنے کاروبار کو بڑھا سکے۔اس نے بھی اپنے ذاتی مفاد کو ملحوظ خاطر رکھ کر عبدالمجید کی تجویز کو قبول کیا۔وہ اس بات کو واضح کرتا ہے کہ اس نے یہ فیصلہ کسی دباؤ میں آکر نہیں کیا:

"سب سے پہلے میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نے یہ فیصلہ کسی دباؤ کے تحت نہیں کیا۔تفصیلی تبادلہ خیال کرنے کے بعد زہرہ جبیں اور میں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ آپ کی تجویز قبول کر لی جائے۔اس قبولیت میں میرا ذاتی مفاد بھی ہے"[15]

ملک کا جو ایک اعلیٰ ادارہ ہے وہ اپنے سارے منصوبے پہلے سے بنا کر رکھتا ہے۔اس نے ہر سیاسی پارٹی میں اپنے خاص بندے شامل کیے ہوتے ہیں۔ان لوگوں کا یہ کام ہوتا ہے وہ اس ادارے کے حکم سے پارٹی بدل لیتے ہیں۔جب بھی کوئی سیاسی پارٹی کمزور کرنی ہو تو وہ سب سے پہلے پارٹی کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں ایک وہ لوگ جو پارٹی کے اپنے ہوتے ہیں اور دوسرے وہ لوگ جو باہر سے پارٹی میں شامل ہوتے ہیں۔دونوں حصوں کی سوچ میں بہت فرق ہوتا ہے جو پارٹی کے اپنے لوگ ہوتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ جتنے بھی بڑے بڑے عہدے ہیں وہ ہمیں ملیں۔لیکن جو لوگ باہر سے پارٹی میں شامل ہوئے ہوتے ہیں ان کو عہدوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا بلکہ ان کا خیال ہوتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ کرپشن کر سکیں۔حکومت کے پاس جو لوگ باہر سے آتے ہیں ان کو جوڑنے کے لیے ایف بی آر کے ذریعے سے بلیک میل کیا جاتا ہے۔بلیک میلنگ کے ذریعے سے ان کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ناول نگار نے اس ناول میں ان کی بہت عمدہ تصویر کشی کی ہے کہ کیسے پارٹی توڑی اور جوڑی جاتی ہے:

"حزب اختلاف کو پہلے ختم کرنے اور پھر غیر موثر بنانے کی کوشش شروع ہو گئیں۔حکمران جماعت دو حصوں میں بٹ گئی جس کی وجہ پارٹی کے اپنے بنیادی ممبران اور موقع تلاش میں آئے عوامی نمائندوں کے درمیان مفادات کی جنگ تھی۔باہر سے آنے والے لوگ لاٹ میں زیادہ کے متقاضی تھے جب کہ پرانے نمائندے اپنی اہمیت میں کمی برداشت

---

[14] ایضاً،110۔

[15] ایضاً،111۔

نہیں کر سکتے تھے۔ مختلف خیالات کے لوگوں کو اکٹھا رکھنا اتنا آسان نہیں اور حکومت کے پاس اس کا نسخہ پہلے سے موجود تھا۔ بیشتر ممبران کسی نہ کسی طرح قابل گرفت تھے اور ان تمام کے خلاف تعطل کا شکار کاروائیوں کو جاری کرنے کے احکام صادر ہو گئے۔ نتیجتاً وہ بے بس اور وفادار ہو گئے "[16]

سیاست میں زیادہ تر لوگ ایسے ہیں جن میں سیاسی بصیرت نام کی کوئی چیز نہیں ۔ وہ لوگ صرف اپنے حلقوں سے نسل در نسل منتخب ہوتے آ رہے ہیں۔ سیاست میں زیادہ اکثریت فیوڈل نمائندوں کی ہے اور یہ لوگ دولت، طاقت اور دھونس جما کر سیاست تک پہنچتے ہیں۔ ان کے نزدیک سیاست طاقت کا ذریعہ ہے اور وہ کسی صورت بھی اس سے الگ نہیں ہونا چاہتے ۔ انہیں ملکی اور بین الاقوامی کسی سطح پر بھی ملک کے مسائل کا ادراک کرنا نہیں آتا۔ ان پڑھ اور جاہل لوگ ہیں جو سیاست کے ٹھیکے دار بنے ہوئے ہیں۔ یا پھر ان میں وہ لوگ شامل ہیں جو باہر کے ملکوں سے ڈگریاں لے کر آتے ہیں اور آ کر سیاست کو اپنی ملکیت سمجھتے ہیں لیکن ان کی سوچ وہی صدیوں پرانی ہوتی ہے۔ ناول نگار نے بہت خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے کہ سیاست ایسے لوگوں کے ہاتھ ہے جو کسی طرح بھی سیاست کے اہل نہیں۔ معظم کے ذریعے سیاسی لوگوں کے انتخاب کی جو تصویر کشی ناول نگار نے بیان کی ہے وہ کچھ اس طرح سے ہے:

"جو لوگ سیاست میں میرے رفقا تھے ۔ میں اکثر ان کے تعقل پر حیران ہوتا تھا۔ نہ وہ کسی قومی یا بین الاقوامی مسئلے کو صحیح تناظر میں دیکھ سکتے تھے اور نہ ہی ان میں اس کا تنقیدی تجزیہ کرنے کی اہلیت تھی۔ الیکشن میں میرے مخالف بدرالدین کی طرح وہ تمام دولت، طاقت اور دھونس کے بل بوتے پر یہاں تک پہنچے تھے۔ سجادہ نشینوں کی طرح ان کی گدیاں تھیں، وہ نسل در نسل منتخب ہو رہے تھے اور یہی وہ لوگ ہیں جن کی کسی سیاسی جماعت یا نظریے سے وابستگی نہیں۔ میرے ارد گرد اکثریت فیوڈل طبقے کے نمائندوں کی تھی۔ ان کی سیاست کا محور طاقت تھا اور وہ ہر ممکنہ ذریعہ سے اس کے ساتھ چمٹے رہنا چاہتے تھے۔ اکثریت نامور بیرونی یونیورسٹیوں سے تعلیم حاصل کر چکی تھی مگر ان کی سوچ وہی صدیوں پرانی تھی "[17]

ملک کا جو بھی حکمران بنتا ہے یا کوئی وزیر بنتا ہے یا کسی بھی سیاسی عہدے پر جاتا ہے ۔ وہ اپنے حلقے کے علاوہ پورے ملک کی خیر اور ترقی کے بارے سوچے گا۔ لیکن اپنے حلقے میں صرف اس لیے کام نہیں کراوتا کہ اگر اس نے اپنے حلقے میں کام کروایا تو پھر وہ اگلا الیکشن کس بنیاد پر لڑے گا۔ ناول نگار نے اس بات کی عکاسی ہے کہ سیاست میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو پورے ملک میں سوچ کی تبدیلی لانا چاہتے ہیں وہ بطور صنعت کار تو آزاد خیال اور فراخ دل ہیں لیکن ان کے اپنے علاقے میں وہی جاگیر دارانہ سسٹم چل رہا ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر مشتاق عادل لکھتے ہیں:

[16] ایضاً، 156۔

[17] ایضاً، 158۔

"ناول نگار نے بہت عمدہ طریقے سے جاگیر دار طبقہ کی ذہنیت، غریبوں پر ہونے والے مظالم اور قیام پاکستان کے وقت ہونے والی قتل وغارت گری کی تصویر کشی کی ہے۔ناول جہاں موضوعاتی لحاظ سے منفرد کاوش ہے وہاں فنی لحاظ سے بھی پاکستانی ناولوں میں اہم مقام کا حامل ہے "[18]

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو دوسرے حلقوں میں تو صنعتیں لگاتے ہیں لیکن اپنے میں نہیں۔اگر آپ آج بھی کسی وزیر مواصلات کو دیکھیں تو وہ پورے ملک میں سڑکوں کے جال بچھا دے گا لیکن اپنے حلقے میں وہ اتنی سہولیات میسر نہیں ہونے دے گا۔اور اسی طرح کے لوگ جمہوریت کے پودے کی جڑوں کے لیے دیمک بن گئے۔ناول نگار نے بہت عمدہ انداز میں عکاسی کی ہے:

"بطور صنعت کار وہ آزاد خیال اور فراخ دل ہیں لیکن اپنے آبائی علاقوں میں سن کی فیوڈل سوچ تبدیل نہیں ہوئی۔وزیر مواصلات تمام ملک میں سڑکوں کا جال پھیلانے کا سوچے گا مگر اس کی کوشش ہو گی کہ اپنے حلقہ انتخاب میں صرف پکی اینٹوں کے راستے بنیں تا کہ صنعتی سوچ جتنی دور رہ سکے بہتر ہے "[19]

ناول "پری" خالد فتح محمد کا ایک منفرد ناول ہے۔یہ ناول موجودہ سیاسی صورت حال اور آمرانہ اقتدار کی عکاسی کرتا ہے۔اس ناول میں انہوں نے سرمایہ دار لوگوں کی خود غرضی اور سیاست میں ان کے کردار کو پیش کیا ہے۔یہ ناول اپنے موضوع اور کرداروں کے لحاظ سے ایک عمدہ اور انفرادیت کا حامل ہے۔اس ناول میں خالد فتح محمد نے اس حقیقت کو عیاں کیا ہے کیسے ہماری فوج سیاست میں شامل ہوئی اور کس طرح وہ حکومتوں کو بنانے اور گرانے میں فعال کردار ادا کرتی ہے۔کس طرح ضیاء الحق کو طیارے کے حادثے میں مارا گیا اور پیپلز پارٹی کو اختیارات سونپے گئے لیکن جیسے ہی پیپلز پارٹی نے خود کو مضبوط کرنا شروع کیا تھا تو مقتدر حلقے اس کی حکومت گرا کر مسلم لیگ (ن) کو آگے لے آئے۔اسی طرح حکومتوں کو بنانے اور ہٹانے میں ادارے ہر حربہ استعمال کرتے ہیں۔ناول نگار نے پاکستان کے اس المیہ پر بھی قلم اٹھایا ہے کہ ہماری کوئی بھی سیاسی پارٹی اپنی میعاد پوری نہیں کرتی، کوئی حکومت تب ہی گرتی ہے جب وہ ان دیکھی قوتوں سے ٹکرانے لگتی ہے۔خالد فتح محمد کے اس ناول میں پاکستان کی بڑی جنگوں کے ہونے کی وجوہات بھی کھل کر سامنے آتی ہیں۔خالد فتح محمد کا یہ ناول حقیقت پر مبنی ناول ہے۔اس کا اسلوب نہایت سادہ ہے۔یہ خالد فتح محمد کا پہلا ناول ہے اور اس ناول نے ان کو بلا کا امتیاز بخشا۔اس ناول کو پڑھنے کے بعد قاری بہت سی حقیقتوں سے آگاہ ہوتا ہے اور کئی طرح کے سوال جو اس کے ذہن میں آرہے ہوتے ہیں ان کی گتھیاں سلجھتی جاتی ہیں۔مختصر یہ کہ پری ایک دلچسپ ناول ہے۔جو موجودہ سیاست اور آمرانہ اقتدار کا عکاس ہے۔

☆☆☆

---

[18] مشتاق عادل، **پاکستانی اردو ناول اور طبقاتی کشمکش** (ساہیوال: فروغ زبان پبلشرز، 2021ء)، 172۔

[19] خالد فتح محمد، **پری** (لاہور: موسیٰ کاظم پرنٹرز، 2006ء)، 159۔